الجواب

توبہ کا مسئلہ توبہ کے مسئلہ میں میرے اور صاحب تعلیمات قرآن کے درمیان لفظی سی نزاع نہیں ہے، جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے بلکہ یہ ایک اصولی نزاع ہے۔ صاحب تعلیمات نے لکھا تھا۔

"آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا اور نہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی"۔

اس پر مجھے دو حیثیتوں سے سخت اعتراض ہے:۔

اولاً، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ قبول ہونے کے بعد بھی گناہ باقی رہتا ہے اور اس کی سزا ملتی ہے۔ یہ بات قرآن کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ برعکس اس کے وہاں تو یہ ارشاد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور انھیں ہدایت بخشی۔ یہ محض صاحب تعلیمات کا اپنا قیاس ہے کہ اللہ نے چونکہ حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا۔ اور توبہ کے بعد انہیں واپس نہیں کیا، لہٰذا (اور یہ وہی "لہٰذا" ہے جس کی خود آپ نے اپنے مضمون ایمان بالرسالت میں مذمت فرمائی ہے) اللہ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی قیاس آرائی کو میں اصولاً ناجائز سمجھتا ہوں، اور یہی وہ تفسیر بالرائے ہے جس کو ہمیشہ سے علمار حق ناجائز کہتے آئے ہیں۔

امر اول کے متعلق جو تصریحات قرآنی اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر چکا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی، لہٰذا اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کروں گا۔

معنی توبہ توبہ کے لغوی معنی وہی ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں، یعنی عود اور رجوع۔ اگر یہ بندے

کی طرف سے خدا کی جانب ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی نافرمانی پر نادم ہوا، اور از سر نو فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا۔ اور اگر یہ خدا کی جانب سے بندے کے حال پر ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت حق نے اس کی ندامت اور اس کے رجوع الی الطاعت کو قبول فرمالیا اور اپنی مہربانی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ بندے کی ندامت و رجوع الی الطاعت اور اللہ تعالیٰ کے اس کی جانب مہربانی کے ساتھ متوجہ ہونے کا نتیجہ کیا ہے؟ آیا یہ کہ اس کا گناہ بخش دیا جائے اور جس سزا کا وہ مستحق ہو چکا تھا، اس سے معاف کر دیا جائے؟ یا یہ کہ صرف توبہ قبول کر لی جائے مگر گناہ پھر بھی باقی رہے اور اس کی سزا پھر بھی دیجائے؟ صاحب تعلیمات دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ ۶ : ۲) پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے، اور بار بار یقین دلاتا ہے کہ جب تم گناہ کر کے اس پر شرمسار ہو گے اور نافرمانی کے بعد پھر اطاعت میں داخل ہو گے تو ہم تمہارے جرم کو مہربانی سے ڈھانک دیں گے (مغفرت) اور اس جرم کے اثر کو مٹا دیں گے۔ (عفو)۔

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵ : ۶)۔

پس جس نے ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور نیک رویہ اختیار کیا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًۢا بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶ : ۶)

جس کسی نے تم میں سے کوئی برا فعل جہالت کی بنا پر کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور نیک رویہ اختیار کر لیا تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

وَ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِہَا وَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْ بَعْدِہَا

اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے پھر ان کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے تو ان کے بعد تیرا رب یقیناً بخشنے والا

لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۷ : ۱۹)	مہربان ہے۔
وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (۲۰ : ۴)	اور یقیناً میں اس کیلیے بڑا بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کیا پھر راہ راست اختیار کی۔
وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّئَاتِ (۴۲ : ۳)	اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔
غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰ : ۱)	وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ بندے کی توبہ کا یقینی نتیجہ حق تعالیٰ کی طرف سے قبول توبہ ہے اور قبول توبہ کا یقینی نتیجہ عفو و مغفرت ہے۔ اور کیسے نہ ہو؟ جو خدا اپنے بندوں میں یہ صفت دیکھنا چاہتا ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (۴۲ : ۴) اور وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۳ : ۱۴) کیا وہ خود اپنے لیے اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ ایک بندہ اپنی فطری کمزوری کی بنا پر گناہ کرنے کے بعد شرمسار ہو اور اس کے آگے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی کا طلبگار ہو، مگر وہ اسے معاف نہ کرے اور سزا دے کر ہی چھوڑے؟ اگر خدا میں یہ صفت ہو تو اس کے سوا پھر کون ہے جس سے انسان مغفرت کی امید کر سکے؟ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۳ : ۱۴)۔

آدم کا گناہ جب یہ قاعدہ کلیہ قرآن مجید سے معلوم ہو گیا تو آدم علیہ السلام کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲ : ۴) اور ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی (۲۰ : ۷) اس کے معنی یہی لینے چاہییں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کے گناہ کو معاف کر دیا۔ محض اس واقعہ پر کہ آدم علیہ السلام جہاں سے نکالے گئے تھے وہاں واپس نہیں کیے گئے، کوئی قیاس قائم کرنا وہ قرآن کے بتائے ہوئے

قاعدے کے خلاف اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اللہ نے قبول توبہ کے باوجود حضرت آدم کے گناہ کو معاف نہیں کیا، ایک ناجائز قیاس آرائی ہے۔ حضرت آدم نے صرف ایک حکم کی خلاف ورزی کی تھی، کوئی شرک نہیں کیا تھا کہ وہ معاف نہ ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴: ۱۸) اور بالفرض اگر وہ شرک بھی کرتے، تو اس سے توبہ کر لینے کے بعد وہ اسی طرح معاف کر دیے جاتے جس طرح عرب کے مشرکین اسلام لانے کے بعد معاف کر دیے گئے۔ لہٰذا ایک مسلمان پر واجب ہے کہ حضرت آدم کے جنت میں واپس نہ جانے کی کوئی اور وجہ تلاش کرے، اور اگر کوئی وجہ اس کو نہ ملے، یا کسی وجہ پر اس کا اطمینان نہ ہو، تو سکوت اختیار کرے اپنی عقل سے اپنے نتیجے نکالنا جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہوں، کسی مومن قانت کا کام نہیں ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا غلط طریقہ | یہ بات ایک حد تک قابل مسرت ہے کہ آپ نے صاحب تعلیمات کا قدم بقدم اتباع نہیں کیا، اور قرآن مجید کے بیانات پر اپنے قیاسی "لہٰذا" کی عمارت نہیں اٹھائی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل افسوس بھی ہے کہ آپ نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اس سے وہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے جو خود قرآن ہی کے مقرر کیے ہوئے ایک قاعدۂ کلیہ کے خلاف ہے۔ آپ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"آدم علیہ السلام نے گناہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا اس صورت میں دی کہ جنت سے نکال باہر کیا۔ آدم علیہ السلام نے اس پر توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، مگر گناہ کی وہ سزا بحال رکھی جو ان کو دی گئی تھی اور گناہ کے اثرات کو زائل نہ کیا، البتہ ان کے لیے قبول توبہ کی یہ شکل اختیار کی کہ انہیں جنت میں واپس آنے کا راستہ بتا دیا۔"

یہ نتیجہ جو آپ نکال رہے ہیں قرآن مجید کی اس تصریح کے خلاف ہے کہ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (۴۲: ۲۵) اس آیت میں تصریح ہے کہ قبول توبہ کے بعد گناہوں کے اثرات مٹا دیے جاتے ہیں۔ مگر آپ اس کے برعکس فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

سے یہ معنی نکال رہے ہیں کہ توبہ قبول کرنے کے بعد گناہ کا اثر باقی رہا اور صرف اس شکل میں توبہ قبول کیگئی کہ وہ راستہ بتادیا گیا جس سے گناہ کے اثرات زائل ہوجائیں۔ یہ بات تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کے خلاف ہے، قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک آیت کی ایسی تفسیر کی جائے جو قرآن مجید کی دوسری آیت یا آیات سے مطابقت رکھتی ہو۔

گناہ سزا اور توبہ کی حقیقت | میں نے سزا اور گناہ کے "فلسفہ" پر جو روشنی ڈالی تھی وہ اسی غرض سے تھی وہ میرا اپنا اختراعی فلسفہ نہ تھا، بلکہ قرآن مجید کے ارشادات سے ماخوذ تھا، اگر آپ اس پر غور فرماتے اور اس کو سمجھ لیتے تو حضرت آدم کی توبہ کے مقبول ہونے اور ان کا گناہ معاف ہوجانے، اور اس کے باوجود ان کے جنت سے نکالے جانے کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ آئیے، اب قرآن مجید سے اُس فلسفے کی تھوڑی سی تشریح سن لیجیے۔

سب سے پہلے یہ قاعدہ ذہن نشین ہوجانا چاہیے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک نظام جسمانی۔ دوسرے عقل جو غور و فکر کرتی اور بھلے بُرے میں تمیز کرتی ہے پہلی چیز پر اللہ تعالیٰ کے قوانین طبیعی (Physical Laws) حکمران ہیں، اور دوسری چیز پر اس کے عقلی احکام واوامر (R..tional Laws) کی حکومت ہے طبیعی قوانین ایک خاص ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں اور سارے عالم مادّی کی طرح انسان کا جسم بھی ان کے ماتحت ہے اس عالم میں انسان جو حرکت بھی کرے گا، اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو قوانین طبیعی کے تحت مقرر ہے، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اس کو بدل دے بخلاف اس کے عالم عقلی میں حرکات کے نتائج اس طور پر مقرر نہیں ہیں جس طور پر عالم طبیعت میں مقرر ہیں۔ یہاں ان کے درمیان اس لحاظ سے تمیز کی جاتی ہے کہ وہ امر الٰہی کے اتباع میں ہیں یا اس کے خلاف! اتباع میں ہیں تو وہ اعمال صالحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر خوش ہوتا ہے، اور انعام دیتا ہے، خواہ قوانین طبیعی کے ماتحت ان کے نتائج

بالکل مختلف صورت میں ظاہر ہوں۔ اور اگر وہ امر الٰہی کے خلاف ہیں تو وہ گناہ ہیں، اعمال قبیحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوتا ہے، اور سزا دیتا ہے خواہ قوانین طبیعی کی رو سے ان کے نتائج اس دنیا میں خوش گوار ہوں۔ اگر انسان کسی گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے، اس کا غضب فرو ہو جاتا ہے اور اس فعل کا وہ عقلی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا جو قوانین عقلی کی رو سے ایسے افعال کے لیے مقرر کیا گیا ہے لیکن توبہ سے اس فعل کے طبیعی نتائج کا بدل جانا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح گناہ ایک امر عقلی ہے اسی طرح توبہ بھی ایک امر عقلی ہے قوانین طبیعی کے اعتبار سے گناہ کی حیثیت محض ایک حرکت کی ہے، اور حرکت سے اسباب طبیعی میں جو تحریک ہوتی ہے، وہ بہر حال اپنے طبیعی نتائج کی طرف منجر ہوتی ہے۔ توبہ سے اس تحریک میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر خاص مصلحت سے اس کے لیے قوانین طبیعی میں کوئی جزئی ترمیم کر دے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ عالم عقلی کی طرح عالم طبیعی کا بھی حاکم مطلق ہے، اس لیے بسا اوقات وہ عالم طبیعت میں بھی امور عقلیہ کے مطابق تصرف کرتا ہے، مثلاً کسی قوم کے گناہوں پر اسے دنیا میں عذاب دینا، او کسی نیک بندے کو ان نتائج سے بچا دینا جو اس کے فعل پر قوانین طبیعی کے تحت رونما ہونے چاہیے تھے او کسی گناہ گار بندے کی توبہ کے بعد ان اثرات کو بھی زائل کر دینا جو قوانین طبیعی کی رو سے ظاہر ہونے والے تھے لیکن یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبیعی میں ترمیم کر دے جس طرح حضرت ابراہیم یا قوم یونس کے لیے کی تھی، اور نہ چاہے تو نہ کرے، جیسا کہ ہم رات دن اہل خیر کو دنیوی مصائب میں مبتلا ہوتے اور اہل شر کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآن مجید کی بکثرت آیات اس پر شہادت دیتی ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام و اوامر کا مخاطب اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ایک جسم نامی متحرک بالارادہ ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ صاحب عقل و فکر اور قوت علمیہ سے بہرہ ور ہے۔ قلنا

فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶: ۱۲) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۰: ۳) وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳۰: ۴) وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲: ۳۷) وَكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲: ۲۷)

اس عقل وفکر کو خطاب کرکے جتنے امر ونہی کے احکام دیے گئے ہیں وہ سب امور عقلیہ ہیں، ان کے اتباع یا ان کی خلاف ورزی میں جتنے افعال انسان کرتا ہے، وہ بھی اس اعتبار سے عقلی افعال ہیں، اور ان پر ثواب وعقاب جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ایک امر عقلی ہے۔ دیکھیے جو لوگ اللہ سے کفر کرتے ہیں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان پر وہ غضبناک ہوتا ہے:۔

مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۶: ۴) عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ (۴۸: ۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵۸: ۳) حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ (۴۲: ۲) اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲۰: ۴) یہ کفر اور نافرمانی بھی عقلی ہے اور اس پر غضب بھی عقلی ہے۔

پھر جب اللہ کسی پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس سے انتقام[1] لیتا ہے اور اسے سزا دیتا ہے:۔

وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (۵: ۱۳) فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰: ۵) اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲: ۲) قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

[1] لفظ انتقام کو لوگ نفسانی انتقام کے معنوں میں لیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ لفظ سن کر کان کھڑے کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ انتقام عقلی ہے عقل وحکمت کا مقتضی یہ ہے کہ حکم کی خلاف ورزی پر حاکم ناخوش ہو اور اس کی سزا دے اور انجام کار میں نافرمان اور فرمانبردار برابر نہ رہیں۔ اسی چیز کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ؟ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸: ۳)۔

(۴۳ : ۲) فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ (۴۳ : ۴) یہ انتقام کبھی تو صرف آخرت میں بشکل عذاب جہنم ہی ہوگا یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴ : ۲) اور کبھی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اسباب طبیعی سے کام لے کر ان قوموں پر بلائیں نازل کرتا ہے جن سے وہ انتقام لینا چاہتا ہے، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۷ : ۱۶) اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۱۵ : ۵) فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (۲۹ : ۴)

ان آیات میں جن دنیوی عذابوں کا ذکر ہے وہ ان قوموں کی حرکات کے طبیعی نتائج نہ تھے، کیونکہ رسولوں کی تکذیب اور آیات الٰہی سے کفر وہ چیز نہیں جس پر قوانین طبیعی کے تحت آندھی اور سیلاب آئیں یا پتھراؤ ہو، یا زمین دھنس جائے۔ اگر کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان امور عقلیہ پر اسباب طبیعی بھی حرکت میں آجاتے ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کی جاتی ہے اور آیات الٰہی سے کفر ہوتا ہے مگر ہر ایسے موقع پر سیلاب نہیں آتے۔ نہ پتھراؤ ہوتا ہے، نہ زمین دھنستی ہے، اس لیے کہ یہ افعال دراصل عقلی افعال ہیں، اور ان کا اصلی نتیجہ عقلی نتیجہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اس دنیا میں ان کے برے نتائج کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح توبہ (جو ایک امر عقلی ہے) کا بھی عقلی نتیجہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا غضب جو گناہ پر بھڑک اٹھا تھا، فرو ہو جائے، اور انسان اس کی عقلی سزا (یا قرآن کی اصطلاح میں انتقام) سے معاف کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس فعل کے جو طبیعی نتائج قوانین طبیعی کے تحت مترتب ہونے والے تھے وہ بھی توبہ کے ساتھ ہی روک دیے جائیں، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی خاص مصلحت کی بنا پر ان کو روک بھی دیتا ہے، جیسا کہ قوم یونس کے حق میں اس نے کیا۔ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْىِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰ : ۱۰) لیکن عموماً وہ عالم مادہ و اجسام میں امور عقلی

کی خاطر عادت مقررہ کو نہیں بدلتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ شراب کی عادت رکھنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں ان کے اعضاء رئیسہ کی خرابیاں توبہ کے ساتھ دور نہیں ہوتیں۔ البتہ وہ توبہ کی بدولت اس کی عقلی سزا سے حسب وعدۂ الٰہی مصئون ہو جاتے ہیں۔

اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ آدم علیہ السلام نے جو فعل کیا تھا اس کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک نفس فعل ہونے کی حیثیت، یعنی شجر ممنوع کو چکھنا جس کا ایک طبعی نتیجہ مقرر تھا۔ دوسری اس کی حیثیت کہ وہ امر الٰہی کے خلاف تھا، ظلم اور گناہ تھا جس کا عقلی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ حضرت آدم یہ فعل کرنے کے بعد اس کے طبعی اور عقلی دونوں نتائج کے مستحق ہو چکے تھے۔ مگر جب انھوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس امر عقلی کی بنا پر اس فعل کے عقلی اثر کو زائل کر دیا، یعنی ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو معاف کر دیا، انھیں برگزیدگی کا شرف عطا کیا اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ رہا ان کے فعل کا طبعی نتیجہ، تو وہ ظاہر ہوا۔ وہ اپنی بشری کمزوریوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد قیام جنت کے لائق نہ رہے تھے اس لیے انھیں زمین پر اتار دیا گیا، اور جنت میں واپس آنے کے لیے شرط لگا دی کہ اپنے نفس پر غلبہ پا کر قیام جنت کا استحقاق ثابت کرو۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹: ۴۰)

آپ کہتے ہیں کہ توبہ کا یہ اثر بھی کیوں نہ ہوا کہ ان کے فعل کا طبعی اثر بھی زائل کر دیا جاتا۔ لیکن یہ اللہ سے خرق عادت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کرنے پر وہ مجبور نہیں۔ وہ یقیناً خرق عادت پر قادر ہے اور جب اس کی مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے تو وہ اپنی اس قدرت کو ظاہر بھی کرتا ہے لیکن امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبعی میں ترمیم کرتا ہمیشہ ضروری نہیں ہے، اور نہ مصلحت خاص کے بغیر وہ کبھی ایسا کرتا ہے بلکہ حضرت آدم کے معاملہ میں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت اسی کی مقتضی تھی کہ ان کے فعل کا طبعی

نتیجہ ہبوط کی صورت میں ظاہر ہوتا، کیونکہ وہ جنت میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ زمین کی خلافت کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کا زمین پر اترنا ضروری تھا۔

غلامی کا مسئلہ | مولنا اسلم جیراجپوری نے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا ہے :

حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یہاں تک کہ جب ان کا زور توڑ لو تو ان کو قید کر لو۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷:۱)۔ پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔[1]

اس آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسیران جنگ کے حق میں دو ہی صورتیں قرآن نے تجویز کی ہیں۔ یا تو بلا کسی معاوضہ کے انھیں رہا کیا جائے یا معاوضہ لے کر لیکن رہا کرنے کا حکم قطعی ہے اور غلام بنا کر رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔

اب ہم کو تین حیثیتوں سے اس آیت پر نظر ڈالنی چاہیے :

اولاً یہ کہ آیت کے الفاظ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ثانیاً یہ کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں اس کی صحیح تفسیر کیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا مفہوم سمجھا اور کس طرح عمل کیا؟

آیت کا مفہوم | آیت میں مَنًّا اور فِدَآءً دونوں کے ساتھ لفظ اِمَّا آیا ہے، جو یا تو تخییر کے معنی میں ہے یا اباحت کے معنی میں یعنی اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہے احسان کرو چاہے فدیہ لے لو، یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے لیے احسان کرنا بھی جائز ہے اور فدیہ لینا بھی۔ اس سے کسی طرح بھی حصر کا مفہوم نہیں نکلتا کہ تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ حکم قطعی تو صرف اس حد تک تھا کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ یعنی جب کفار سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مار چکو اور ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔ اس حکم کے بعد مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے یا ان کو بتایا

[1] ترجمہ خود مولانا اسلم جیراجپوری کا ہے

کیا جاتا ہے کہ چاہیں قیدیوں کے ساتھ احسان کریں چاہیں فدیہ لے لیں۔

اس کے بعد لفظ مَنّ قابل غور ہے۔ مَنّ کے معنی صرف احسان کے ہیں "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ اگرچہ احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ قید کی حالت میں اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ اس صورت کی نفی" اور صرف رہائی میں مفہوم احسان کا انحصار کہاں سے نکلتا ہے۔ اگر قرآن میں کوئی لفظ یا اشارہ ایسا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ احسان سے مراد صرف رہا کر دینا ہے، تو براہ کرم اس کو بیان کیا جائے۔

قرآن مجید کی دوسری آیات | اب تلاش کیجیے کہ قرآن میں کونسی آیت ایسی ہے جس میں یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑنے کے سوا کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے اور ان کو غلام بنا کر رکھنا حرام ہے یقیناً ایسی کوئی آیت آپ پیش نہیں کر سکتے، برعکس اس کے لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق بکثرت احکام آپ کو قرآن میں ملتے ہیں جو مذکورۂ بالا آیت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے احکام کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک رہائی کا حکم قطعی نہیں آیا تھا اس لیے لونڈی غلاموں کا رکھنا جائز تھا اور ان کے متعلق احکام بھی آئے تھے لیکن بعد کی آیات کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اس آیت کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں اس کی رو سے تو یہ آیت نازل ہوتے ہی تمام لونڈی غلام رہا ہو جانے چاہیے تھے۔ مگر بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہا نہیں ہوئے، اور ان کے متعلق اسی طرح احکام آتے رہے جس طرح پہلے آتے تھے۔

آیت مذکورہ سورۂ محمد کی ہے جس کا کچھ حصہ مکہ میں اترا ہے، اور کچھ حصہ مدینۂ طیبہ کے ابتدائی زمانہ میں۔ ابن عباسؓ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ "جب جنگ بدر کے روز کفار سے تمہارا مقابلہ ہو" اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کی تائید قرآن مجید کی یہ آیت کرتی ہے۔ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَۃ (۹ : ۸)

یہ آیت جنگ بدر کے قیدیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور اس میں جو عتاب نازل ہوا ہے وہ صاف اشارہ کرتا ہے

کہ سورہ محمد والی آیت میں شدّ وثاق سے پہلے اثخان فی الارض کا جو حکم دیا گیا تھا، اس پر پورا پورا عمل درآمد نہ کرنے کی وجہ سے عتاب فرمایا گیا پس متحقق ہو گیا کہ سورہ محمدؐ کی یہ آیت سنہ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

اب ملاحظہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان لونڈیوں کو جائز کیا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الّٰتِيٓ آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ (۳۳ : ۶)
اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں تمہاری وہ بیبیاں جن کے تم نے مہر ادا کیے ہیں اور وہ لونڈیاں جو خدا نے تم کو جنگ میں بطور غنیمت دلوائی ہیں۔

اس آیت میں ما ملکت یمینک سے مراد لونڈیاں ہیں، اور لونڈیوں کی تعریف مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ (جو اللہ تعالیٰ نے تم کو لڑائی میں بطور غنیمت دلوائی ہوں) سے کی ہے سب جانتے ہیں کہ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فے عطا نہیں کیا تھا۔ لہذا بدر کے بعد لڑائیوں میں جو عورتیں مسلمانوں کے پاس قید ہو کر آئیں انہی کو لونڈیاں بنا کر رکھنا قرآن مجید نے جائز قرار دیا تھا پھر ارشاد ہوتا ہے

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (۳۳ : ۶)
اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ ان کو بدل کر دوسری بی بیاں کر لو، اگرچہ تم کو ان کا حسن پسند آئے مگر لونڈیاں حلال ہیں۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ تک پہنچ چکی تھی حضور کا آخری نکاح سنہ کے خاتمہ پر ہوا ہے لہذا اس آیت کے نزول کا زمانہ سنہ سمجھنا چاہیے یہاں بھی ما ملکت یمینک کی تحلیل موجود ہے

سنہ کے اواخر میں غزوہ اوطاس ہوا بہت سی عورتیں پکڑی ہوئی آئیں ان میں جو بیاہی ہوئی عورتیں تھیں ان کے معاملے میں مسلمان متردد ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴ : ۴)
تمہارے لیے بیاہی ہوئی عورتیں حرام ہیں، مگر وہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر تمہارے ہاتھ آئیں

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ( )

اور اگر تم کو خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکوگے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار۔ اور اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکوگے تو ایک ہی نکاح کرو یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

یہ حکم ۳ھ اور ۴ھ ہجری کے درمیان کا ہے۔ ان مختلف احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے قرآن مجید کا مقصود وہ نہ تھا جو مولانا اسلم جیراجپوری نے سمجھا ہے۔ ورنہ اس آیت کے نزول کے بعد لونڈیوں کا رکھنا سرے سے ممنوع ہو جاتا نہ کہ اس کی اجازت دی جاتی اور ان کے متعلق احکام دیے جاتے

ایک نکتہ اس سلسلہ میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ایک لطیف نکتہ بھی بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن میں جہاں جہاں مملوکوں کا ذکر ہے بصیغہ ماضی یعنی ما ملکت ایمانکم ہے بصیغہ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی" اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جو احکام بصیغہ ماضی ارشاد ہوئے ہیں وہ مستقبل کے لیے نہیں ہیں۔ مثلاً گیلڑ لڑکیاں اپنے سوتیلے باپوں کے لیے جس آیت میں حرام کی گئی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِہِنَّ (۴: ۴) یہاں دَخَلْتُمْ صیغہ ماضی ہے لہٰذا صرف ان عورتوں کی بیٹیاں حرام ہوئیں جو نزول آیت سے پہلے مسلمانوں کے نکاح میں آچکی تھیں۔ آئندہ کے لیے یہ حکم نہیں ہے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ (۸: ۵) اس میں بھی خمس کا حکم صرف ماضی کے لیے ہے۔ بعد کے غنائم میں خمس نہیں ہے۔ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ (۶۲: ۲) میں جمعہ کی نماز کا حکم بھی ان لوگوں کے لیے تھا جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ بعد کے مسلمان اس حکم سے بچ گئے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ (۴۲: ۳)

میں صرف ان اختلافات کا فیصلہ احکام الٰہی کی رو سے کرنے کا حکم ہے جو پہلے واقع ہو چکے تھے۔ بعد کے اختلافات میں حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ ہوگا۔ غرض جناب مولانا نے یہ ایسا نکتہ نکالا ہے جو آج تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ ورنہ اب تک مسلمان ان بہت سے احکام کی بندشوں سے آزاد ہو چکے ہوتے جو بصیغہ ماضی دیے گئے تھے، اور جن میں اللہ میاں نے (نعوذ باللہ شاید بے احتیاطی کی بنا پر) مستقبل کا صیغہ استعمال نہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح تو کافروں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے لیے بھی آتش دوزخ سے رہائی مل جاتی کیونکہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (۶۴:۱۰) میں کفروا اور کذبوا دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ لہٰذا بعد کے تمام کفار و مکذبین اس وعید سے بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ آفرینی معنوی تحریف کی حد تک پہنچتی ہے۔ قرآن مجید کے معانی میں ایسی تحریف کرتے ہوئے ایک مسلمان کا ایمان لرز جانا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا کیا مفہوم سمجھا، اور اس پر کس طرح عمل کیا۔

بنی قریظہ کے حق میں حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ ان کے بالغ مرد قتل کیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نافذ فرمایا۔

خیبر کی جنگ میں بہت سی عورتیں گرفتار ہوئیں اور وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ ام المومنین حضرت صفیہ انہی عورتوں میں سے تھیں۔

غزوۂ حنین میں ۶ ہزار عورتیں اور بچے قید ہوئے۔ بعد میں ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اس نے سبایا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جو میرے اور بنی عبدالمطلب کے قبضہ میں ہیں ان کو میں احسان کے طور پر رہا کرتا ہوں۔ مگر دوسروں کے معاملہ میں حکم دینے کا مجھے حق نہیں۔ صرف سفارش کر سکتا ہوں۔ چنانچہ حضور کی سفارش پر انصار اور مہاجرین نے اپنے اپنے حصے کے سبایا کو چھوڑ دیا۔ مگر

بنو تمیم اور بنو فزارہ اور بنو سلیم کے نمایندوں نے انکار کیا۔ آخرکار حضور نے ان سے وعدہ کیا کہ بعد کی لڑائیوں میں جو سبایا ہاتھ آئیں گے ان میں سے ہم تمکو ایک ایک کے بدلے چھ چھ دیں گے۔ تب وہ ہوازن کے قیدیوں کو چھوڑنے پر راضی ہوے۔

اوطاس کے سبایا کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جن کے حق میں خود قرآن مجید کی آیت وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ نازل ہوی۔

اس میں شک نہیں کہ حضور نے بعض مواقع پر قیدیوں کو احسان کے ساتھ رہا بھی کیا ہے کبھی قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا ہے، اور کبھی زر فدیہ لے کر بھی چھوڑ دیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے عہد میں بکثرت قیدی لونڈی غلام بنا کر بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کیا قرآن مجید کے احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا اور ان کے مطابق عمل کرنے والا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے تو سمجھے دیکھیے اس کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، اور وہ اسی قانون کو برحق سمجھتے ہیں جو اللہ کے رسول نے اپنے قول و عمل سے بنا دیا ہے۔ (باقی)

فضل فونٹین پن

سینیر ۸۶ جونیر ۱۱۰

نیا اسٹاک آچکا ہے

خوبصورت پائدار قیمت واجبی علاوہ اس کے سامان اسٹیشنری و کاغذ وغیرہ خط و کتابت سے طلب فرمائیے۔

فدا علی محمد علی تاجر کاغذ پتھر گٹی حیدرآباد دکن